نام کتاب: پاکستان، سیاست اور اسلامی قانون　　مؤلف: پروفیسر ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی
ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی　　صفحات: ۲۷۸۔ قیمت: ۲۵۰ روپے
مبصر: پروفیسر ڈاکٹر وقار احمد زبیری　　تقسیم کنندہ: اکیڈمی بک سینٹر۔ ڈی۔۳۵، بلاک۔۵ فیڈرل بی ایریا، کراچی

''پاکستان سیاست اور اسلامی قانون'' کی طبع ثانی پیشِ نظر ہے۔ اس کتاب کے مؤلف سائنس کے معروف اور معتبر استاد ہیں۔ مگر ایسے دردمند پاکستانی ہیں جو اپنی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں اور خود کو محض ایک دائرے میں محدود نہیں رکھتے ہیں۔ دراصل تدریس تحقیق اور تصنیف ان کی بنیادی دلچسپی ہے۔

اس کتاب کے پیش لفظ میں جناب جسٹس حمود الرحمٰن نے بالکل صحیح بات کہی ہے ''معاصر دور کے واقعات پر قلم اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ امکان رہتا ہے کہ معاصر واقعات سے مصنف کی قربت اس کے مشاہدے کو دھندلا نہ دے اور اس کی حقیقت پسندی کی راہ ذاتی تعصّبات اور ذہنی رکاوٹوں سے پاک ہو اور جو حقائق کی تعبیر کے لیے درکار ہوتی ہے حائل نہ ہو جائے''۔

اس کتاب کے مطالعے سے واضح طور پر ادراک ہوتا ہے کہ مصنف نے حقائق بیان کرنے میں کسی تعصب، کسی ذہنی رکاوٹ کو حائل نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے مفید معلومات کو مناسب طریقے سے ترتیب دے کر پیش کر دیا ہے۔ مصنف کی پوری کوشش یہ محسوس ہوتی ہے کہ بس حقائق پیش کیے جائیں ان پر کسی ذاتی تبصرے سے گریز کیا جائے۔

کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں قرار دادِ مقاصد سے لے کر ۱۹۷۳ء تک کے آئین، ان میں ترامیم۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات پھر ضیاء الحق کا مارشل لاء خاصی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ باب دوم میں ان رکاوٹوں کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو اسلامی نظام کی راہ میں حائل ہیں۔ باب سوم میں مذہبی رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں کا کردار پیش کیا گیا ہے اور آخری باب میں پاکستان ناگزیر تھا، پاکستان ناگزیر ہے اور کتابیات پیش کی گئی ہے۔

جناب مہدی علی صدیقی نے 'مقدمے' میں فرمایا ہے ''میں ان کی عرق ریزی اور معاملہ فہمی کو خراجِ تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اپنے اصل موضوع کے بیان میں انہوں نے بہت سی ایسی معلومات فراہم کر دی ہیں جو سیاسی اور دستور جزیات تک پر مشتمل اور شاید کہیں اور یہ مشکل سے یکجا ہیں۔

مہدی علی صدیقی کا آخری جملہ ہی ہماری رائے میں اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ ''وہ تمام لوگ جو پاکستانی تاریخ سے واقف ہونا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب حقائق کی ایک ذمہ دارانہ دستاویز ہے۔ جس سے حسبِ ضرورت استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ کے طلبہ، تحقیق کرنے والے اساتذہ اور طلبہ کے لیے بہت مفید ہوگی۔ اس کتاب کو ہر کتب خانے میں ہونا چاہیے۔'' کتاب سفید کاغذ پر خوبصورت اور جاذب نظر سرورق کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ قیمت بھی مناسب ہی ہے۔

نام کتاب: اسلام اور ذات پات　　مصنف: پروفیسر ڈاکٹر مظہر معین

ناشر: ادبستان، ۴۳ ریٹی گن روڈ لاہور　　صفحات: ۴۶۴۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

مبصر: پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق منصوری

امت مسلمہ آج جس اخلاقی زوال، معاشرتی انتشار، معاشی افلاس، سیاسی گراوٹ اور علمی جمود کا شکار ہے ہر دردمند انسان اس پر مضطرب اور بے چین ہو جاتا ہے۔ مگر امتِ مسلمہ کی نئی شیرازہ بندی کے لیے ہمیں اپنے ریزہ ریزہ تنکوں کو چننے کی ضرورت ہے۔ پہلے مرض کی بے لاگ تشخیص اور پھر اس کا صحیح علاج کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر سید مظہر معین شعبۂ عربی پنجاب یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے یہی کٹھن فریضہ انجام دینے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر صاحب نے ہر لحاظ سے اس موضوع کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذات پات کے حوالے سے قرآن مجید کی آیات، احادیث نبوی، فقہاء عظام کی آراء، اسلامی تاریخ، اکابر امت کے اقوال اور طب جدید تک سے استفادہ کیا ہے۔ ذات پات سے متعلق آیات کی تفسیر میں مختلف مفسرین کی آراء کو پیش کیا ہے۔ ان میں امام ابن کثیرؒ، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، علامہ آلوسیؒ، سید قطبؒ، شیخ مصطفیٰ العراغیؒ، مولانا تھانویؒ، سید مودودیؒ، امین احسن اصلاحیؒ، پیر کرم شاہ الازہریؒ شامل ہیں۔ اسی طرح محدثین، علماء اور فقہاء کی آراء پیش کرتے ہوئے ہر دور اور ہر نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں اصحابِ صحاح ستہ اور فقہائے اربعہ کے علاوہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، انور شاہ کشمیریؒ، امجد علی رضویؒ، مولانا احمد رضا بریلویؒ، مفتی کفایت اللہؒ، ابوالکلام آزادؒ، علامہ اقبالؒ، پیر سید مہر علی شاہؒ، مولانا گوہر رحمانؒ، مولانا عبدالحکیم اشرف قادریؒ، سید نصیر گیلانیؒ اور پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمان شامل ہیں۔

ڈاکٹر خالد علوی کتاب کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''کتاب کا اسلوب علمی ہے، کوئی بات حوالہ کے بغیر نہیں کہی گئی ہے ترتیب عمدہ ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر باب کے اختتام پر خلاصہ یا حاصل بحث درج ہے، قرآن وسنت کی نصوص پیش کرتے ہوئے من مانی تاویلات سے گریز کیا گیا ہے۔ مفسرین ومحدثین کی توضیحات پیش کی گئی ہیں۔ قرآن وسنت کی نصوص تو واضح ہیں ان میں نسلی امتیاز اور خاندانی تفوق کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ وہ تو مساواتِ انسانی کا ایسا تصور پیش کرتی ہیں جس کے اظہار وتنفیذ کا یارا عہد حاضر کے مفکر ومقتدر قوتوں کو بھی نہیں۔ حقوقِ انسانی کے علمبردار اور عظمتِ انسانی کے حدی خوان ترقی یافتہ معاشروں سے نسل پرستانہ رجحانات کو ختم نہیں کرا سکے۔ یورپ وامریکا میں غیر سفید فام انسانی گروہوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان کے لیے ندامت کا باعث ہونا چاہیے۔'' (ص:۱۳)

آج امریکا گوانتاناموبے، عراق، افغانستان اور پوری دنیا میں جس طرح مذہبی امتیاز کی بنیاد پر بے قصور مسلمانوں کو ظلم و بربریت کا نشانہ بنارہا ہے اور جس طرح اس نے ہیروشیما اور ویتنام کے انسانوں پر ظلم وستم کی انتہا کردی یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امریکا کے نزدیک تمام انسانوں کے حقوق برابر نہیں ہیں۔

ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی ازہری تعارف میں لکھتے ہیں: ''فضائل ومناقب کی اہمیت، فضیلت اور اصلیت سے انکار ممکن نہیں کیونکہ خالقِ کائنات نے خود اپنی کتابِ مقدس میں اور باعثِ کون ومکاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث مبارکہ میں جلیل القدر انبیاء کرامؑ اور جانثار صحابہ کرامؓ کی عظمتوں کا اظہار فرمایا ہے''۔لیکن تحقیق کے طالبانِ ارفع وادنیٰ میں حدود قائم کرتے کرتے اتنی گہرائی میں چلے جاتے ہیں کہ ارفع وادنیٰ کے بنیادی قواعد تو نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں اور غیر مستقل عارضی واجبی چیزیں لازم قرار پاجاتی ہیں، جس کے نتیجے میں بسا اوقات ارفع، ادنیٰ اور ادنیٰ ارفع ہوجاتا ہے اور یہی کچھ سرگزشت برصغیر پاک وہند میں ذات پات اور کفوٴ کے مسئلہ کے ساتھ درپیش ہوئی۔

پروفیسر مظہر معین تقدیم میں لکھتے ہیں ''دینِ اسلام نے اہل عرب وفارس وروم ویونان کے نسلی تفاخر کے خصوصی پس منظر میں توحیدِ ربانی ووحدتِ انسانی کا جو آفاقی پیغام بنی نوع انسان کو دیا اس نے ہر زمان ومکان میں امت مسلمہ کی بلا امتیاز عرب وعجم مساواتِ انسانی کی بنیاد پر تشکیل وتنظیم کی،.....مسلمانانِ برصغیر کے مابین اپنی ذات برادری سے باہر نکاح و ازدواج بالعموم قولاً وفعلاً ناقابل برداشت وباعث ننگ وعار حتیٰ کہ منجانب برادری ''حقہ پانی بند'' کردینے کا باعث قرار پاتا رہا اور یہ سلسلہ تقسیم ہند وقیام پاکستان کے بعد بھی کافی حد تک جاری وساری ہے۔

.....کفو اور غیر کفو کے فقہی وشرعی عنوانات کے تحت خلطِ مبحث وسیع پیمانے پر باعث اشکال واضطراب ہے۔لہٰذا قرآن وسنت، فقہ وسیرت اور تاریخ وتعاملِ امت کی روشنی میں نسلی تفاخر وتنافر کی حقیقت ونوعیت کا تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ مسلمانانِ برصغیر کے مذہبی وثقافتی پس منظر میں ایک ناگزیر علمی وعملی ضرورت ہے''۔(ص:۱۷۔۱۸)

محمد حماد لکھوی لکھتے ہیں ''محترم ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ استدلال واستنباط سے دیانتدارانہ علمی اختلاف وتنقید کی گنجائش بہرحال موجود ہے۔''(ص:۴۶۴)

نسلی تفاخر اور قبائلی عصبیت انتہائی طاقتور محرک ہے، ڈاکٹر صاحب نے انتہائی اخلاص اور دل سوزی کے ساتھ جس برائی کو ختم کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے کسی صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ''کم نسب'' لکھنا مناسب نہیں لگا۔(ب) نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چچازاد سیدہ ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب (ہاشمیہ قرشیہ) کا نکاح مقدادؓ بن اسود (غیر ہاشمی غیر قرشی وبروایت غیر عرب، کم نسب، آزادشدہ غلام اسود) سے کرکے بنوہاشم وقریش کے تفاخر نسب پر ضرب لگائی''۔(ص:۱۹۱)

(ج) علاوہ ازیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ہاشمی وقریشی وعرب معززین کو چھوڑ کر اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ (غیر ہاشمی، غیر قریشی کم نسب) کو اپنا منہ بولا بیٹا (متبنیٰ) قرار دیا (۱۹۱) یہاں کم نسب کا لفظ غلط فہمی کا باعث ہوسکتا

ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی مراد یہ ہے کہ اسلام کے دیے ہوئے معیار تفاخر کے بجائے جو لوگ دوسرے نسلی ونسبی معیارات رکھتے ہیں اُن کی نگاہ میں مقدادؓ اور زیدؓ کم نسب تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں تو وہ تقویٰ کی بنیاد پر عالی نسب تھے کیونکہ تقویٰ میں وہ قریش اور ہاشمیوں سے آگے تھے۔ بہرحال آئندہ اشاعت میں اس پر نظرثانی کر لی جائے۔ اسی طرح مجموعی طور پر ہاشمی اور غیر ہاشمی، قریشی اور غیر قریشی، عرب اور غیر عرب کی اصطلاحات کا استعمال کس ذہن کی غمازی کرتا ہے ان مفاہیم کو ادا کرنے کے لیے دوسرا کون سا مناسب اسلوب اختیار کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر صاحب لکھتے ہیں: ''اختلاف انساب وقبائل کی بناء پر ایک دوسرے کو حقیر جاننا ممنوع ہے اور کسی کو نسب کی عار دلانا انتہائی قابل مذمت گناہ ہے۔ کسی کو کسی پر فضیلت نسبی حاصل نہیں الّا یہ کہ دین وتقویٰ کی بنیاد ہو ورنہ سب اولادِ آدم کی حیثیت سے مساوی النسب ہیں، روزِ قیامت اللہ تعالیٰ اپنے معیار نسب یعنی تقویٰ کو سربلند فرمائے گا اور انسانوں کے تفاخر نسب کو نیچے پھینک دے گا۔ (ص:۱۸۹)

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول قرآن مجید اور ذات پات میں معروف قدیم وجدید مفسرین کی اس سے متعلقہ آیات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے کہ از روئے قرآن رسولِ خدا سیدنا آدم وسیدہ حوا سلام اللہ علیہما کی تمام اولاد مشترک و مساوی النسب ہے۔ (ص:۱۱۲)

باب دوم۔ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور ذات پات کے بارے میں ہے اس میں آپ نے متعلقہ احادیث مکمل حوالوں کے ساتھ عربی متن اور اردو ترجمے کے ساتھ درج کی ہیں صرف ایک حدیث نقل کر رہا ہوں۔ ترجمہ: ''جس کا عمل اس کو سست رفتار رکھے اس کا نسب (خدا کے ہاں) تیز رفتار نہیں بنا سکتا''۔ (صحیح مسلم، کتاب الذکر، باب فضل الاجتماع علیٰ تلاوۃ القرآن) (ص:۱۲۶)

باب سوم ذات پات بحوالہ سیرت وتاریخ ہے اس کے خلاصہ میں لکھتے ہیں ''ان تمام نقاط واشارات سے (بعض روایات ہر ممکنہ جرح وتنقید کی گنجائش رکھنے کے باوجود) بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عہدِ نبوی وخلفاء راشدینؓ، نیز عصر صحابہؓ وتابعینؒ ومابعد میں بلاامتیاز قریش وبنو ہاشم وعرب وعجم محض عقیدہ اسلامی کے اشتراک وکفائت کی بناء پر نکاح و ازدواج کی لاتعداد مختلف ومتنوع مثالیں خود بنو فاطمہ وبنو ہاشم وقریش سمیت جملہ اہلِ اسلام میں موجود اور کتبِ سیرت و تاریخ میں بکثرت محفوظ چلی آ رہی ہیں۔

چوتھے باب میں اقوالِ اکابر امت بسلسلۂ ذات پات پیش کیے ہیں جن کا خلاصہ یہ شعر ہے:

بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

(اقبال)

پانچواں باب طب جدید اور ذات پات پر مشتمل ہے اس باب میں لکھتے ہیں کہ اپنے خاندان سے باہر شادی کرنے سے لاتعداد موروثی امراض کا خاتمہ ہو جاتا ہے، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے اعلیٰ اور صحت مند نسل پروان چڑھتی ہے اس سلسلے

میں طبی سائنس کے ماہرین کی آراء دی ہیں۔

فہرست مراجع میں بعض مراجع نامکمل ہیں جیسے ابن قدامۃ کی المغنی، علامہ سرخسی کی المبسوط، ان کا مقام طباعت اور سن طباعت درج کیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

اخیر میں مختلف اہلِ علم وتحقیق کی کتاب کے بارے میں آراء درج ہیں جن میں جسٹس علامہ مجدد مرزا، جسٹس ڈاکٹر منیر احمد مغل اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سمیت ۲۳ اہل علم کی آراء دی گئی ہیں۔ ہاشمی صاحب کی رائے کا ایک حصہ نقل کررہا ہوں۔

''اسلام کا مزاج آفاقی ہے مگر بدقسمتی سے مسلم معاشرے میں مرورِ زمانہ کے ساتھ جاہلی تعصّبات پھر سے سر اٹھانے لگے۔ ہندو سماج کے زیر اثر برعظیم میں مسلمانوں کے ہاں بھی ذات پات کا امتیاز برتا جانے لگا۔ بیسویں صدی کی تحریکات آزادی کا ایک قابل قدر اور روشن پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعہ مسلمانوں کے ہاں اسلامی اور ملّی تشخص کا جذبہ نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ لیکن بدقسمتی سے ہندی مسلمانوں کی سائیکی (نفسیات، مبصر) میں ذات اور برادری کے تعصّبات اس طرح رچ بس گئے تھے کہ یہ ملّی جذبہ بھی ان تعصّبات کو ختم نہیں کرسکا۔ اگرچہ مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب بھی بڑھا ہے دینی اور اسلامی تحریکوں کے اثرات میں بھی اضافہ ہوا ہے.....لیکن اِن تمام قابل قدر رجحانات کے باوجود نمود ونمائش کا رجحان اور بتانِ رنگ وبو کا شکنجہ ہماری معاشرتی زندگی کو ابھی تک بری طرح جکڑے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر سید مظہر معین نے مسلم معاشرے کی اس دکھتی رگ کو چھیڑا ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم وسیرت رسولؐ اور اسوۂ صحابہؓ کی روشنی میں ذات کے اس جاہلی تصور کا تجزیہ کیا ہے.....زیر بحث موضوع پر پروفیسر موصوف نے جو کاوش وعرق ریزی کی ہے وہ ان کے دلی اضطراب، دردمندی اور شدید اسلامی جذبے کی غماز ہے۔ انہوں نے اپنے مؤقف کے حق میں جو تفصیلی شواہد مہیا کیے ہیں وہ بہت مستند اور جامع ومانع ہیں۔

عہدِ حاضر میں امت مسلمہ کو بہت سے خطرات درپیش ہیں اور خصوصاً اہل مغرب کی مہم جو یلغار اور اسلامیانِ عالم پر ذہنی وفکری اور سائنسی ومادّی غلبے کے لیے اس کی مجنونانہ تگ ودو ایک بہت بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے پہلے ہمیں اپنے ریزہ ریزہ تنکوں کو چن کر آشیاں بندی کرنی ہے پھر اپنی گم شدہ متاع ومیراث کی بازیافت کا مرحلہ بھی سر کرنا ہے۔ اگر ہم بدستور ذات پات کے غیر اخلاقی اور احمقانہ تصورات سے چمٹے رہیں گے تو جمود اور جہالت کی اسیری سے کبھی چھٹکارا نہیں پاسکیں گے.....کتاب کی طباعت وکاغذ عمدہ ہیں اور قیمت کم ہے۔

نام کتاب: تربیت گاہ ''ڈیپر'' ایک استاد کی ڈائری (بزبان سندھی مع انگریزی ترجمہ)۔اشاعت: ۲۰۱۰ء۔صفحات: ۶۰
مصنف: ڈاکٹر صالح محمد شاہ۔　　مترجم: پروفیسر ڈاکٹر نیاز احمد میمن۔　قیمت: تحفہ از مسز ڈاکٹر حیدر خان نظامانی
مبصر:　پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق منصوری　　ناشر:　سائل لاکھو میموریل کمیٹی، ہالا، سندھ

۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۰ء یہ منصورہ (ڈیپر) کا پہلا دور ہے اس دور کے بارے میں ڈاکٹر صالح محمد شاہ مرحوم (متوفی ۹ جولائی ۱۹۸۱ء) کی ڈائری (تربیت گاہ ''ڈیپر'' ایک استاد کی ڈائری۔انگریزی ترجمہ "The Vision of Teacher 'DEPER' A diary of Teacher"، شیر محمد شاہ کا تعارف، اور رئیس علی احمد نظامانی صاحب کا ابتدائیہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

منصورہ کے دوسرے دور ۱۹۶۰ء-۱۹۷۱ء تک کے بارے میں کچھ تحریریں پروفیسر سید محمد سلیم مرحوم (۱۵/دسمبر ۱۹۲۳ء تا ۱۸/اکتوبر ۲۰۰۰ء) مولانا جان محمد بھٹو مرحوم (متوفی ۱۰ ستمبر ۱۹۸۲) ، مولانا غلام سرور بھٹو مرحوم کے حوالے سے مل جاتی ہیں۔

منصورہ کا تیسرا دور ۱۹۷۱ء سے شروع ہوا ہے، ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو منصورہ کی مکمل تاریخ کو یکجا کر دے جو منصورہ کے بانی حضرت شفیع محمد نظامانی مرحوم (۱۸۹۶ تا ۱۳/اپریل ۱۹۷۰ء) کی پیدائش سے لے کر آج تک منصورہ کی تاریخ پہ محیط ہو۔

یہ ڈائری مولانا کے نواسے رئیس علی احمد نظامانی صاحب کی کاوشوں سے زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ہے ان کے گاؤں گوٹھ کرم خان نظامانی تحصیل ہالا، ضلع مٹیاری سندھ خط لکھ کر منگوائی جاسکتی ہے یا ان کے موبائل ۰۳۰۰۔۳۲۴۵۴۶۱ پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

ڈائری میں دیگر تصاویر کے علاوہ مولانا شفیع محمد نظامانی مرحوم کی ایک تصویر شامل ہے۔

مولانا نظامانی کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اُنہیں اسکول کے لیے ابتدا ہی سے ایسے اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر میسر آتے رہے جو اخلاص کے ساتھ اُن کی تعلیم وتربیت کے مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔

ڈاکٹر صالح محمد شاہ لکھتے ہیں: ''۱۹۴۸ء میں جب ہالا تعلقہ میں جبری تعلیم کا آغاز ہوا تو دوسرے اسکولوں کی طرح اس اسکول کی بھی بنیاد رکھی گئی جو کبھی اچھا کبھی برا چلتا رہا، مارچ ۱۹۴۸ء میں جب برادرم قادر بخش شاہ (قادن شاہ) یہاں ہیڈ ماسٹر بن کر آئے تو اسکول کا نقشہ ہی بدل گیا تیز رفتار ترقی ہوئی مارچ ۱۹۵۱ء تک یہی حال رہا۔ مگر مارچ ۱۹۵۲ء میں اسکول کی حالت اتنی خراب ہوچکی تھی کہ وہ بند کر دیا جاتا، اسکول کے بانی کی تمام کاوشوں کے باوجود یہی صورت حال رہی۔ اپریل ۱۹۵۲ء میں کالج سے لوٹا تو مجھے اس اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے طور پر بھیجا گیا جب میں تقرر نامہ لے کر پہنچا تو میرے

لیے یہاں ایک نئی دنیا بنی ہوئی تھی۔''

میں نے آتے ہی جو حالت دیکھی اس کا مختصر سا حال لکھنا ضروری ہے۔''کیا دیکھتا ہوں کہ اساتذہ کے آرام کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے جب کہ جگہ کی کمی نہیں ہے چار پائیاں اسکول کے برآمدوں میں ادھر اُدھر پڑی ہیں بستر بکھرے ہوئے ہیں...رات کا کھانا جن برتنوں میں کھایا گیا وہ اب تک دھلے نہیں ہیں۔اسکول میں کوئی اسمبلی ہوتی تھی نہ ہی کوئی ٹائم ٹیبل تھا اسکول میں بیٹھے ابھی آدھا گھنٹہ نہیں گزرا تھا کہ کھانا آ گیا، میں نے کچھ نہیں کھایا کیوں کہ یہ اسکول کی ڈیوٹی کا وقت تھا، اُس وقت میں نے ٹائم ٹیبل بنایا اور ایک سرکلر جاری کر دیا کہ اسکول کے اوقات میں کوئی بھی ذاتی کام نہیں کیا جائے گا چار پائیاں ہٹانے کا حکم دیا۔ میں نے عجیب حالت دیکھی کہ گاؤں کے لوگ گپ شپ کرنے کے لیے اسکول کے اساتذہ کے پاس آ جاتے ہیں۔اس کے خاتمہ کے لیے میں نے گاؤں کی طرف والا دروازہ ہی بند کروا دیا اب وقت کی پابندی کے ساتھ کام ہونے لگے اب اسکول کے اوقات میں کوئی پرندہ اسکول میں پر نہیں مار سکتا تھا، اساتذہ کہتے کہ:''یہ عزرائیل (موت کا فرشتہ) کہاں سے آ گیا ہے۔''(ص:۱۸۔۱۹،سندھی)

اس ڈائری کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ حضرت مولانا نظامانی مرحوم کے پیش نظر ہمیشہ اساتذہ اور طلبہ کی صحیح تعلیم و تربیت رہی اس لیے ابتدائی دور میں بھی سرکاری اسکول کے اساتذہ کرام اور ہیڈ ماسٹر صاحبان کو بھی آپ نے اس نصب العین سے وابستہ کر دیا۔ہاسٹل کا نام تربیت گاہ رکھا، ڈاکٹر سید صالح محمد مرحوم کو بھی اس تربیت گاہ نے سب سے زیادہ متاثر کیا جس کی روح رواں خود مولانا نظامانی مرحوم کی ذات تھی۔ڈاکٹر صالح محمد شاہ مرحوم ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۲ء تک منصورہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے اسکول کو تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بہتر بنائے رکھنے میں بھرپور کوشش کی لیکن وہاں کے نظام تعلیم و تربیت کو اُن کا خواب اور انہی کا کارنامہ قرار دینا کچھ مبالغہ آرائی محسوس ہوتا ہے (Page-10 English) جس سے حضرت مولانا نظامانی مرحوم کی شخصیت ثانوی محسوس ہوتی ہے گلستان ڈیپر و منصورہ میں جس دور میں جو بھی پھول کھلے اس میں مختلف ادوار میں مختلف شخصیات کی کاوشیں رہی ہیں لیکن بنیادی چیز مولانا نظامانی مرحوم کا ہی سوز جگر درد دِل فیضانِ نظر اور ایثار و اخلاص فی سبیل اللہ ہے۔

چودھری غلام محمد مرحوم کے بارے میں پروفیسر سید محمد سلیم مرحوم کے مضمون (افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی، مطبوعہ افکارِ معلم جنوری ۲۰۰۱ء) سے پتا چلتا ہے کہ''۱۹۵۲ء میں مولانا نظامانی مرحوم کے شدید اصرار پر چودھری غلام محمد مرحوم (اس وقت کے امیر جماعتِ اسلامی سندھ) نے ادارۂ تعمیر ملت قائم کیا جس کی صدارت کی ذمہ داری مرتے دم تک اُن کے کاندھوں پر رہی۔ جماعت اسلامی پاکستان نے یہاں ایک دارالعلوم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔مولانا عبدالغفار حسن اس کے ناظم مقرر ہوئے ۶ مئی ۱۹۵۶ء کو مولانا امین احسن اصلاحی نے ڈیپر آ کر اس کا افتتاح کیا...۱۵ نومبر ۱۹۵۹ء میں شاہ ولی اللہ اورنٹیل کالج قائم ہوا۔راقم نے فروری ۱۹۶۰ء سے کالج کا چارج سنبھالا۔ستمبر ۱۹۷۲ء میں حکومت نے اسکول اپنی

تحویل میں لے لیا۔'' ۱۹۶۱ء تک کے ان اہم واقعات میں سے کسی واقعہ کی طرف بھی شاہ صاحب کی ڈائری میں کوئی اشارہ بھی نہیں ہے کیا وہ ان چیزوں سے بے خبر رہے یا لاتعلق رہے؟

سندھی میں ص ۱۸ پر تربیت گاہ ڈیپر کا سال ۱۹۵۲ء لکھا ہے جب کہ انگریزی ترجمہ میں صفحہ نمبر ۱۶ پر School of Depar the year 1954 درج ہے۔ سندھی میں جبری تعلیم کا سال ۱۹۴۸ء جب کہ انگریزی میں ۱۹۴۵ء درج ہے۔ ڈائری کی سندھی عبارت اور انگریزی ترجمہ میں مندرجہ ذیل اغلاط کی آئندہ اشاعت میں تصحیح کر دی جائے۔

ماہنامہ افکارِ معلم لاہور کے اپریل ۲۰۰۲ء کے شمارہ میں میرا ایک چھوٹا سا مضمون ''منصورہ سندھ کے بانی مولانا شفیع محمد نظامانی مرحوم'' چھپا ہے ۱۹۷۲ء میں ریڈیو پاکستان کے پروگرام بزمِ طلبہ میں سندھی مباحثہ میں دوسری پوزیشن لینے پر مجھے پروگرام ڈائریکٹر نے کہا کہ آپ کو ریڈیو پر ایک اور پروگرام دیا جا رہا ہے ''میری پسندیدہ شخصیت'' اس پر ایک مختصر مضمون لکھ لائیں۔ اس وقت میں نے اپنی پسندیدہ شخصیت کے طور پر محترم نظامانی مرحوم کا نام پیش کیا تو ڈائریکٹر صاحب نے کہا کہ آپ کوئی مشہور و معروف شخصیت منتخب کریں میں نے کہا میری پسندیدہ شخصیت مولانا شفیع محمد نظامانی مرحوم ہی ہیں۔ یہ پروگرام ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہوا یہی تحریر افکار معلم میں شائع ہوئی۔ یہ تحریر اور اس کے ساتھ کچھ اور مواد میں نے رئیس علی احمد نظامانی صاحب کو دیا تھا جب وہ مولانا شفیع محمد نظامانی مرحوم کے سلسلے میں ڈاکٹر پروفیسر نبی بخش بلوچ صاحب کی صدارت میں ایک کانفرنس کرنے کے لیے تگ و دو کر رہے تھے۔

اس طرح افکارِ معلم جنوری ۲۰۰۱ء کے شمارہ میں میرا ایک مضمون ''پروفیسر سید محمد سلیم منصورہ میں'' چھپا۔ محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے مولانا جان محمد بھٹو مرحوم اور چودھری غلام محمد مرحوم کے بارے میں دو کتابیں لکھی ہیں۔ ماہنامہ تعمیر افکار کراچی نے مارچ۔مئی ۲۰۰۳ء کا شمارہ سید سلیم نمبر شائع کیا ہے جب کہ افکارِ معلم کا جنوری ۲۰۰۱ء کا شمارہ ''ارمغانِ علمی'' میں سید سلیم کو ان کی زندگی ہی میں خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ محترم مولانا امیر الدین مہر صاحب کا مولانا نظامانی مرحوم کے بارے میں مضمون جسارت میں چھپا تھا۔ (۱۹/اپریل ۲۰۰۹ء)

یہ ڈائری اس تاریخی سلسلے کی ایک دستاویز ہے انگریزی کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہونا چاہیے تھا۔ سندھی سے اردو ترجمہ منصورہ ہی کے کئی اساتذہ کر سکتے ہیں۔ ہدیہ تبریک کے طور پر چند کلمات شیخ الحدیث حضرت مولانا آغا محمد صاحب مدّ ظلھم العالی کے شامل ہوتے تو کتابچہ کے لیے خیر و برکت کا باعث بنتے۔ امید ہے آئندہ اشاعت میں ناشر کی طرف سے اس تشنگی کا مداوا کر دیا جائے گا۔

جب تک منصورہ سندھ کی تاریخ پر کوئی جامع کتاب شائع نہیں ہو جاتی منصورہ کے بارے میں موجود تمام تحریروں کو ایک نام کے تحت یکجا کر کے کئی جلدوں میں شائع کر دیا جائے جیسا کہ مصر کے معروف ادیب ڈاکٹر طہٰ حسین نے ابوالعلاء المعری کے بارے میں قدیم و جدید اکثر اہم تحریروں کو ایک ضخیم جلد میں جمع کر کے شائع کیا تھا۔

نام کتاب: جدید وقدیم عربی ادبیات میں تنقید　　ادارت وترتیب: پروفیسر ڈاکٹر سید کفیل احمد قاسمی

ناشر: شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا　　پروفیسر ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری

مبصر: پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق منصوری، شعبۂ عربی۔ جامعہ کراچی　　صفحات: ۳۷۰۔ قیمت: درج نہیں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے تحت ایک قومی سیمینار **النقد الادبی العربی بین القدیم و الجدید** کے عنوان سے ۱۷، ۱۹ مارچ ۲۰۰۶ء کو منعقد ہوا، جس میں مذکورہ موضوع پر عربی زبان میں ۱۶، اردو میں ۸، اور انگریزی میں ۳، مقالات پڑھے گئے۔ ۲۰۰۷ء میں جناب پروفیسر ڈاکٹر سید کفیل احمد قاسمی منتظمِ سیمینار اور جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد صلاح الدین العمری اس وقت کے صدر شعبۂ عربی نے ان مقالات کو مرتب کر کے شعبہ کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔

ہندو پاک میں نقد عربی پر تصنیف وتالیف کے سلسلے میں شدید تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ سیمینار کے منتظمین نے پورے ہندوستان کے عربی زبان وادب کے محققین واساتذہ کو اس موضوع پر تحریر وتقریر کی دعوت دے کر اس پیاس کو بجھانے کا سامان کیا ہے۔ اختصار کے باوجود بعض مقالات میں موضوع کے مختلف پہلوؤں پر بڑی خوبصورت تحریریں ملتی ہیں۔

موضوعات کی وسعت اور تنوع کا اندازہ مقالات کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی ہو جاتا ہے۔

اردو مقالات:

۱۔ عربی ادب میں تنقید کا ارتقاء۔　　پروفیسر زبیر احمد فاروقی

۲۔ عربی تنقید کے اہم مباحث۔　　پروفیسر ابوالکلام قاسمی

۳۔ عربی تنقید پر بوطیقا کے اثرات۔　　پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

۴۔ حضرت حسان بن ثابت الانصاری کا شعری نقطہ نظر۔　　ڈاکٹر عائشہ

۵۔ متنبّی شناسی اور ابو منصور ثعالبی کا نظریۂ تنقید۔　　پروفیسر عبدالباری

۶۔ عبدالقاہر جرجانی کا فن نقد۔　　پروفیسر محمد نعمان خان

۷۔ یحییٰ حقی کا تنقیدی اور فنی شعور۔　　پروفیسر محمد راشد ندوی

۸۔ زکی مبارک، جدید مصر کا ایک بیباک ناقد۔　　ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

انگریزی کے مقالات:

1- Ibn Qutaiba, His Ingenuity / Prof Shafi Shaikh

2- The'alibi's Methods of Criticism, / Prof.Dr.Md.Abu Bakar Siddiqui

3- Ibn Qutaiba, His Literary Endeavour, / Dr.Mohd.Yousuf Khan

عربی مقالات:

۱. النقد العربی القدیم	پروفیسر محمد حسان خان
۲. النقد علی لغة القصة والمسرحیة	پروفیسر بدرالدین الحافظ
۳. الخیال عند نقاد العرب و بلاغیهم	ڈاکٹر شاد حسین
۴. نظریة الهرمینو طیقا، فی الفکر العربی	پروفیسر محمد اقبال حسین
۵. النقد و دراسات الاعجاز	ڈاکٹر عبدالماجد ندوی
۶. منطلق الحداثیین من النقد	ڈاکٹر محمد قطب الدین
۷. النقد الادبی فی الادب المهجری	ڈاکٹر محمد قطب الدین
۸. حرکته الدیوان واثرها فی النقد	پروفیسر سلیمان اشرف
۹. مساهمة المرأة فی النقد	پروفیسر فرحانه صدیقی
۱۰.الغربال واسلوبه فی النقد	ڈاکٹر عبدالقدوس
۱۱.ابن الرومی حیاته من شعره	ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
۱۲.قدامه بن جعفر: خدماته النقدیة	مولانا سعید اعظمی
۱۳.ابوالفرج الاصبهانی: خدمات نقدیة	ڈاکٹر ولی اختر
۱۴.ابومنصور الثعالبی: بین عرض ونقد	ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن
۱۵.ابراهیم عبدالقادر المازنی	ڈاکٹر راشد نسیم ندوی
۱۶.الاستاذ سید قطب الناقد	پروفیسر محمد اجتباء ندوی

مذکورہ مقالات میں قدیم وجدید ادبی تنقید کے اہم موضوعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس اعتبار سے یہ ایک انتہائی قابلِ قدر کاوش ہے۔اس مجموعہ کے اکثر مقالات نفس مضمون کے انتہائی ادراک وتفہیم کے بعد صفحۂ قرطاس پر منتقل کیے گئے ہیں۔البتہ بعض مقالات اپنے عصری شعور اور لسانیاتی استشہاد وتقابل کے سبب رعنائی ونزاکت اور لطافتوں کی انتہاؤں کو چھورہے ہیں۔

ابوبکر عبدالقاہر جرجانی (متوفی ۴۷۴ھ/ بمطابق ۱۰۸۲عیسوی) پانچویں صدی ہجری کی نمایاں ادبی شخصیات میں سے ہیں۔پروفیسر نعمان خان نے ان کے فن نقد کا مطالعہ کرتے ہوئے اعجاز قرآن کے سلسلے میں ان کے نظریہ کی وضاحت بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔وہ ابوعبیدہ معمر (متوفی ۲۰۹ھ) کی مجاز القرآن، عمرو بن بحر بن محبوب الجاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) کی البیان والتبیین، ابن المعتز (متوفی ۲۹۶ھ) کی کتاب البدیع، قدامہ بن جعفر (متوفی ۳۳۷ھ) کی نقد الشعر ونقد النثر،

ابو ہلال العسکری (۳۹۵ھ) کی کتاب الصناعتین، الباقلانی (۴۳۲ھ) کی اعجاز القرآن کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ہر ایک نے بلاغتِ قرآن کے ضمن میں نقدِ ادب وشعر پر گفتگو کی لیکن اب تک یہ بات طے نہ ہوسکی تھی کہ قرآن کریم دوسرے ادب سے ممتاز وفائق اور معجزہ ہے تو کیوں ہے؟۔کوئی اعجاز لفظوں میں بتاتا، کوئی معانی کو معجز گردانتا تھا، ایک طبقہ نظمِ عبارت کو وجہِ امتیاز سمجھتا تھا۔ یہ ساری باتیں دوسرے کلام میں بھی موجود تھیں گو قرآن کریم کے درجہ کی نہ سہی''۔(ص۲۶۱)

''مختصراً یہ کہیے کہ جرجانی کے یہاں فصاحت وبلاغت، ترتیب وترکیب، عبارت اور حسن ادا میں لفظ کا کوئی دخل نہیں بلکہ الفاظ کے حسن ترتیب، ان کا حسن انتخاب اور پھر برمحل استعمال فصاحت کی روح ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

''کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ کلمہ فصیح ہے تاوقتیکہ اس کلمہ کو برمحل استعمال نہ کیا گیا ہو اور سیاق وسباق کے کلمات سے حسن صورت اور حسن معنیٰ میں پوری طرح ہم آہنگ نہ ہو بلکہ ان کے مجموعی حسن میں موید ہو''۔

پروفیسر صاحب نے اس دقیق اور عمیق نظریہ کو برصغیر کے پس منظر میں اردو زبان کی شاعری سے اس کا خوبصورت استشہاد کیا ہے جس سے اردو شاعری کی نزاکتوں کو سمجھنے والا قرآن مجید کے معجزانہ اسلوب کا کسی نہ کسی حد تک ادراک و احساس کرسکتا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

''قرآن کریم کے اعجاز کا راز اس کے نظم میں ہے مثال کے طور پر اردو کا یہ شعر دیکھیے''۔

؎ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اسے مختلف تراکیب میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔مثلاً:

۱۔ (اے) نادان دل تجھے کیا ہوا ہے۔اس درد کی آخر کیا دوا ہے؟ (نثر)

۲۔ دل احمق/ بودا/ تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

۳۔ کیا ہوا ہے تجھے دلِ نادان۔آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

۴۔ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔اس مرض کی بھلا دوا کیا ہے؟

میں نے چار ترکیبیں پیش کی ہیں اور بھی بن سکتی ہیں، لیکن بغیر کسی تجزیہ وتحلیل کے صرف ذوق شعری سے آپ یہ فیصلہ خود کرلیں گے کہ اصل شعر کے علاوہ دوسری تمام تراکیب میں وہ حسن نہیں جو اصل میں ہے۔۔۔ وجہ کیا ہے؟ (ص۲۶۴۔۲۶۵) پھر تمام مفروضہ تراکیب کا تجزیہ کرکے لکھتے ہیں۔

''آپ نے دیکھا کہ شعر کا کوئی لفظ نہ بدلا جاسکتا ہے نہ ہی ان کی ترتیب میں تصرف مفید ہوسکتا ہے''۔(ص۲۶۶)

ڈاکٹر صاحب نے کئی اشعار کا مختلف ادبی خصوصیات کے حوالے سے تجزیہ کیا ہے ہم طوالت کے سبب انہیں نقل نہیں کرسکتے البتہ وہ اشعار لکھ دیتے ہیں:

ے ستون وار پر رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

ے موجِ خوں سر سے گزر رہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

ے جوئے خون آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ے کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

ے دور محفل سے وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پر سر رکھ کے، سحر سے پہلے

ے کر رہا تھا غم جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

ے وہ جس کو بھلانے کی ہم نے رو رو کے دعائیں مانگی تھیں
رات وہ اس کا یاد نہ آنا یاد آیا تو روئے بہت

وہ لکھتے ہیں ''یہ جرجانی کے نظریہ نظم کی چند مثالیں ہیں، استعارات وتشبیہات پر تفصیلی بحث، ان کے رموز ولطائف کی نشاندہی، نظم کلام میں ان کی اہمیت وغیرہ اسرار البلاغۃ (از جرجانی) میں دیکھی جاسکتی ہے۔(ص۲۷۲)

اس مجموعے کے باقی مقالات بھی اپنی اپنی منفرد خصوصیت رکھتے ہیں البتہ کچھ مقالات میں تشنگی محسوس ہوئی جیسے ڈاکٹر عائشہ کا مقالہ ''حضرت حسان بن ثابت الانصاری کا شعری نقطہ نظر'' اصمعی کا قول نقل کیا ہے کہ ''حسانؓ کے شعر جاہلیت میں بہت اعلیٰ تھے لیکن اسلام کے بعد وہ کمزور ہو گئے (ص۲۵۰) اس کی مکمل وضاحت کی یہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ استشہاد کرتے ہوئے جو عربی کے اشعار پیش کیے گئے ہیں اگر اردو کے اس مقالے میں ان کا اردو ترجمہ بھی شامل ہوتا تو بہتر ہوتا۔

شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یہ کاوش علم وادب کے موسم خزاں میں انتہائی قیمتی متاع ہے۔ ان پھولوں کی خوشبو سے پاکستان بھی مہک رہا ہے۔

کتاب مجلّد رنگین ٹائٹل کے ساتھ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے، قیمت درج نہیں۔